پہلی قسط

فلسطین، اسرائیل اور سر ظفر اللہ خان

پروفیسر مشتاق خان کیانی (لندن)

میں جناب پروفیسر راجہ نصر اللہ خان صاحب کا مشکور ہوں کہ انھوں نے اخبار ''اردو ٹائمز'' میں سر ظفر اللہ خان سے متعلق میرے ایک مضمون پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ پروفیسر موصوف نے جذبات کے بے لگام گھوڑے پر سوار ہو کر ناچیز پر تنقید کرتے وقت نہ تو اپنے معزز پیشے کا خیال رکھا اور نہ ہی علمی روایات اور عام شائستگی کی پروا کی۔ جہالت کا فتویٰ صادر فرما کر میرے خیالات اور رائے کو گستاخی اور کیچڑ اچھالنے سے تعبیر کیا اور میرے علم و دانش پر خطِ تنسیخ کھینچ کر اُسے صفر کے برابر قرار دیا:

تمہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

ظاہر ہے کہ اس طرح کی سوقیانہ استدلال اور دشنام طرازی کا بنیادی مقصد مجھے ڈرا کر خاموش کرنا تھا۔ عام طور پر یہ حربے وہ حضرات استعمال کرتے ہیں جو ٹھوس تاریخی حقائق سے یا تو بالکل نابلد ہوتے ہیں یا اُن کو ڈر رہتا ہے کہ ان تاریخی حقائق کے عیاں ہونے سے کہیں ان کے خیالی اور فرضی محلات چکنا چور نہ ہو جائیں۔ یا تقدس کے مسند پر بٹھائے ہوئے اُن کے خود ساختہ دیوتاؤں کے چہرے بے نقاب نہ ہو جائیں۔

یہ ایک انسانی کمزوری ہے کہ جب آدمی تاریخی شواہد اور معقول دلائل سے تہی دست ہو جاتا ہے تو دشنام طرازی اور بدکلامی کی بیساکھی کا سہارا لے کر چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ کاش کہ راجہ صاحب یہ عامیانہ وطیرہ اختیار نہ کرتے اور شائستگی کے دائرہ میں رہ کر اپنے خیالات کا اظہار فرماتے۔

راجہ صاحب کیچڑ اچھالنے کے لغوی معنی اور مفہوم سے قدرے نا آشنا معلوم ہوتے ہیں۔ کسی پر علمی یا تاریخی نقطہ سے تنقید کرنا کیچڑ اچھالنا نہیں ہوتا۔ بلکہ حقائق پر مبنی علمی اور تاریخی تنقید کو علماء کے ہاں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ کیچڑ اچھالنا دراصل انگریزی محاورہ Mud Slinging کا لفظی ترجمہ ہے۔ یہ محاورہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب آپ کسی کے کردار، اخلاق یا کریکٹر پر جھوٹے الزامات لگاتے ہوں۔ حال ہی میں سکاٹ لینڈ کے ایک مشہور یونین لیڈر اور سکاٹش پارلیمنٹ ممبر کے متعلق News of The World اخبار نے لکھا کہ ''یہ صاحب فاحشہ عورتوں کی محفل کا راجہ اندر ہیں۔'' اس پر جناب ٹامی اشفیڈ نے عدالت سے رجوع کیا اور شکایت کی کہ اخبار مذکور نے ان پر Mud Slinging یعنی کیچڑ اچھالا ہے۔ عدالتِ عالیہ نے اخبار سے ثبوت مانگا۔ جب اخبار ثبوت پیش نہ کر سکا تو پھر اخبار کو معافی

مانگنے اور ایک بھاری رقم بطور معاوضہ دینے کا حکم ہوا۔

جنگِ عراق کے حوالے سے ٹونی بلیئر اور جارج بش سخت تنقید کا نشانہ بنتے رہتے ہیں مگر یہ کیچڑ اچھالنا نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ جائز اختلاف رائے اور تعمیری تنقید ہوتی ہے ۔ ورنہ یہ حضرات بھی عدالت سے رجوع کرتے اور Mud Slinging کے تحت مقدمہ دائر کرتے۔

راجہ نصر اللہ صاحب اگر دیانت داری سے اس مسئلہ پر غور فرمائیں تو اُن پر واضح ہوگا کہ میں نے سر ظفر اللہ خان کے اخلاق یا کریکٹر کا ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ اپنی ذاتی (Private) زندگی میں نہایت مذہبی آدمی تھے اور اپنے مذہبی اصولوں کے سختی سے پابند تھے۔ یہاں سر ظفر اللہ خان کی ذاتی زندگی نہیں بلکہ ان کے سیاسی خیالات اور اجتماعی زندگی زیر بحث ہے۔ اس میں قائداعظم اور لیاقت علی خان کو گھسیٹ کر بیچ میں لانے کے کیا معنیٰ ؟ ان کا تو اس کہانی میں ذکر ہی نہیں تھا:

وہ بات جس کا فسانے میں کوئی ذکر نہیں
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

اگر میرا گزشتہ مضمون غور سے پڑھا جائے تو واضح ہوگا کہ میں نے مرحوم لیاقت علی خان کے متعلق یہ ہرگز نہیں کہا تھا کہ وہ اسرائیل سے سفارتی تعلقات رکھنے کے حق میں تھے۔ میں نے مرحوم کا اس ضمن میں ذکر کیا تھا کہ وہ اسرائیل سے دوستی کے سخت خلاف تھے مگر ان کے شہید ہونے کے بعد سر ظفر اللہ خان نے اسرائیلیوں سے یہ کہا تھا کہ اگر لیاقت علی خان زندہ ہوتے تو اسرائیل کو تسلیم کرتے اور سفارتی تعلقات قائم رکھتے جو کہ سراسر جھوٹ اور غلط بیانی تھا۔ یہاں بلاوجہ قائداعظم اور لیاقت علی خان کو بیچ میں لا کر ان کے نام پر ایک جذباتی اور اشتعال انگیزی کی فضا پیدا کر کے مرحومین کے ناموں پر جذباتی تجارت کرنا ایک نہایت مذموم فعل ہے اور سر ظفر اللہ خان کے ناقدوں کو دشنام طرازی اور گالی گلوچ سے خاموش کروانے کی کوشش ایک غیر علمی اور بازاری حرکت ہے جسے انگریزی میں (Emotional Blackmail) کہتے ہیں۔

ہاں میں راجہ صاحب کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے جناب ظفر اللہ خان صاحب سے کوئی ذاتی بغض یا عناد نہیں ہے۔ میں صرف چند تاریخی شواہد پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ یہ حقائق اگر چند حضرات کو ناخوش گوار لگیں تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں:

پڑتی ہے پڑ جائے شکن ان کی جبیں پر
سچائی کا اظہار تو کرنا ہی پڑے گا

ذاتی طور پر میں نے ہمیشہ سر ظفر اللہ خان کو ایک قابل اور تجربہ کار جج اور وکیل مانا ہے اور ان کی فنی اور قانونی قابلیت پر کبھی شک نہیں کیا۔ اگرچہ مجھے ان سے کبھی ملنے کا شرف حاصل نہیں ہوا مگر اقوامِ متحدہ میں ان کی لمبی لمبی اور کسی حد تک بورنگ (Boring) تقریریں سننے کا موقع ضرور ملا۔ موصوف اپنی ٹھیٹھ پنجابی لہجہ میں انگریزی بولنے میں مشہور اور نمایاں تھے۔

یہاں میں ایک بات کا ذکر ضرور کروں گا کیوں کہ میرے لیے یہ ایک معمہ اور باعث تعجب ہے۔ میں نے اپنے مضمون میں بہت سے لوگوں پر تنقید کی ہے۔ خاص طور پر سر ملک فیروز خان نون اور اس قماش کے دوسرے ٹوڈی جاگیردار، خطاب یافتہ، ذہنی غلام جو انگریز سامراج کے پروردہ خادم تھے اور اِنھی لوگوں کی جاسوسی، خدمت اور تعاون کی وجہ سے ہندوستان میں برطانوی سامراجی نظام قائم اور مسلط رہا۔ پھر نئے ملک پاکستان میں قائداعظم کے وفات کے بعد یہی ٹولہ مکمل طور پر مسلط ہوگیا تھا۔ مگر راجہ نصر اللہ خان نے صرف سر ظفر اللہ خان پر تنقید کا برا منایا اور ناراض ہوگئے۔ دوسرے بے چاروں کو نظر انداز کر کے ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا اور صرف سر ظفر اللہ خان کے دفاع میں ہتھیار لے کر کھڑے ہوگئے۔ کاش کہ راجہ جی یہ بتاتے کہ سر ظفر اللہ خان سے ان کا جذباتی لگاؤ اور روحانی عقیدت مندی کی کیا وجہ ہے۔ آخر وہ سر ظفر اللہ خان پر تنقید سے اس قدر برافروختہ اور سیخ پا کیوں ہوگئے؟

بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

راجہ صاحب کا یہ اعتراض بالکل بجا ہے کہ میں نے اپنے مضمون میں کسی کتاب وغیرہ کا حوالہ نہیں دیا۔ اس کی دو وجوہات تھیں: ایک یہ کہ یہ اخبار یعنی ''اردو ٹائمز'' ایک تجارتی، کاروباری اور کمرشل اخبار ہے اور اشتہارات پر چلتا ہے۔ اس لیے اشتہارات کو زیادہ جگہ دی جاتی ہے۔ دوسرے مضامین کے لیے جگہ بہت کم رہ جاتی ہے۔ جگہ کی قلت کی وجہ سے مضمون لکھتے وقت اختصار کا خیال رکھا جاتا ہے۔ کتابوں کے نام اور دوسرے حوالوں سے اس لیے گریز کرنا پڑتا ہے کہ یہ بہت جگہ لیتی ہیں۔ اب چونکہ فاضل مضمون نگار نے مطالبہ کیا ہے تو کتابوں کے حوالے ساتھ ساتھ دیتا جاؤں گا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ بعض واقعات اور تاریخی حقائق اس قدر عام اور مشہور ہوتے ہیں کہ ان کے متعلق کتابوں کے حوالے غیر ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی یہ کہے کہ تاج محل مغل بادشاہ شاہ جہان نے بنوایا تھا تو اس کے لیے کسی کتاب یا حوالے کی ضرورت نہیں۔

راجہ صاحب نے اپنے خیالات کی تائید اور سر ظفر اللہ خان کے دفاع میں چار وجوہات یا دلائل پیش کیے ہیں:

(۱) ظفر اللہ خان کو مرحوم محمد علی جناح نے وزیر خارجہ بنایا تھا۔ قائداعظم کا کسی کو عہدہ پیش کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ شخص تمام برائیوں اور کوتاہیوں سے مُبرا ہے۔ ایسے شخص پر تنقید کرنا قائداعظم پر تنقید کرنے کے مترادف ہے۔ ایسا کرنا نہ صرف گستاخی ہے بلکہ جہالت ہے۔

(۲) سر ظفر اللہ خان کی خودنوشت سوانح ''تحدیثِ نعمت'' ان کی خوبیوں اور کمالات کا مرقع ہے۔

(۳) سر ظفر اللہ خان کی تائید اور تعریف میں پاکستانی اور غیر پاکستانی حکام اعلیٰ اور اکابرین کے بیانات اس بات کی دلیل ہیں کہ موصوف تنقید سے بالا تھے۔

(۴)　اقوامِ متحدہ میں اسرائیل کے خلاف اور فلسطین کے حق میں سر ظفر اللہ خان کی تقریریں اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ صہیونی (Zionist) نہ تھے بلکہ مسلمانوں اور فلسطینیوں کے مفاد میں کام کرتے تھے اور ان کے دوست اور خیر خواہ تھے۔

میں اب راجہ صاحب کے مندرجہ بالا نقاط پر باری باری تبصرہ کروں گا۔

سب سے پہلے جناب نصر اللہ خان نے اخبار ''نوائے وقت'' کا حوالہ دیا ہے جس سے شاید یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ سر ظفر اللہ خان کو محمد علی جناح نے پاکستان کا وزیر خارجہ مقرر کیا تھا۔ میرے خیال میں تو اس حوالے کی سرے سے ضرورت ہی نہ تھی کیوں کہ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔ اس حقیقت سے نہ مجھ کو اور نہ ہی کسی اور کو انکار ہو سکتا ہے۔ کہ سر ظفر اللہ خان کو قائداعظم محمد علی جناح نے وزارتِ خارجہ کا عہدہ پیش کیا تھا مگر قائداعظم کا کسی کو عہدہ پیش کرنا اس بات کی دلیل نہیں کہ جس شخص کو یہ عہدہ دیا جا رہا ہے وہ ضرور اچھا، نیک، مخلص اور مقدس شخص ہوگا۔ قائداعظم ایک سیاسی پارٹی کے لیڈر اور ایک قابل وکیل تھے۔ وہ نہ تو کوئی ولی اللہ تھے اور نہ علم غیب جاننے کے دعوے دار تھے۔ جہاں تک مجھے علم ہے قائداعظم نے کبھی بھی اپنے ولی اللہ، تقدس یا غیب کی باتیں جاننے کا دعویٰ نہیں کیا۔ پھر ہم کیسے خود بخود فرض کر لیں کہ ہاں جی قائداعظم بندے کو دیکھ کر اندازہ لگا سکتے تھے اور بتا سکتے تھے کہ یہ بندہ اچھا ہے یا برا ہے؟ جو قائداعظم کے متعلق اس قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں اور ان کو پیروں، ولیوں اور غیبی علوم کے ماہر سمجھتے تھے۔ وہ قائداعظم کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کو خانقاہوں میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنا چاہیے۔ اپنی بے تکی بات کو ثابت کرنے کی کوششیں ناتمام میں قائداعظم کو پیروں اور ولیوں کا درجہ دے کر مرحوم کے کندھوں پر بندوق رکھ کر گولی چلانا اُن پر ایک بہت بڑا ظلم ہے۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض انسان بہت خود غرض، مفاد پرست اور ابن الوقت ہوتے ہیں اور اپنا مطلب حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کے روپ بدلتے رہتے ہیں اور اپنے اصلی مقاصد اور ارادوں کو چھپانے میں بڑے ماہر ہوتے ہیں:

جب بھی چاہیں اک نئی صورت بنا لیتے ہیں لوگ
ایک چہرے پہ کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ
مل بھی لیتے ہیں گلے سے اپنے مطلب کے لیے
آپڑے مشکل تو نظریں بھی چُرا لیتے ہیں لوگ

سر ظفر اللہ خان بھی ایک چہرہ پر کئی چہرے سجانے میں اور نئی سے نئی صورت بنانے میں ایک تجربہ کار ماہر تھے۔ وہ ظاہر میں کچھ اور باطن میں کچھ اور تھے۔ یہ صحیح ہے کہ قائداعظم نے سر ظفر اللہ خان کو وزیر خارجہ کا عہدہ پیش کیا تھا مگر اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ قائداعظم کو ظفر اللہ خان کے مخلص اور وفادار ہونے کا یقین تھا بلکہ اس کی اور وجوہات تھیں۔ ایک وجہ یہ تھی کہ نیا ملک پاکستان ایک نہایت مشکل دور سے گزر رہا تھا۔ ہندوستان سے مہاجروں کی یلغار اور ان کی آبادکاری، وسائل کی کمی اور

انتظامیہ نظام کی عدم موجودگی اور افراتفری کی فضا نے نہایت مشکل حالات پیدا کیے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ سخت قحط الرجالی تھی۔ اچھے سند یافتہ اور تجربہ کار کارکنوں کی قلت تھی۔ ان حالات کے دباؤ میں قائداعظم کی نظر سر ظفر اللہ خان پر پڑی اور آپ نے انھیں اپنی ٹیم میں شامل کرلیا۔ کیوں کہ خان صاحب میں وہ تمام ظاہری خوبیاں موجود تھیں، وہ ایک قابل قانون دان اور جج تھے اور انتظامی امور میں تجربہ رکھتے تھے۔ وہ وائسرائے کے ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بھی رہ چکے تھے اور خاصا تجربہ کار تھے۔ دوسری وجہ انھیں وزیر خارجہ بنانے کی یہ تھی کہ ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے تعلقات قائد اعظم سے اچھے اور دوستانہ نہ تھے۔ قائد کے متعلق ان کی رائے اچھی نہ تھی۔ وہ مسٹر جناح کو ایک خشک مزاج، غیر دلچسپ اور حسِ مزاح سے عاری اور گرم جوشی سے محروم سمجھتے تھے۔ اس کے برخلاف مسٹر جناح کے حریف اور سیاسی رقیب پنڈت جواہر لال نہرو سے وہ بہت متاثر تھے۔ کیوں کہ ان کی رائے میں مسٹر نہرو ایک دلچسپ، خوش مزاج، بذلہ سنج اور رونقِ محفل قسم کے آدمی تھے۔ وائسرائے کے اس معاندانہ اور غیر دوستانہ رویہ کی وجہ سے قائداعظم کو اُن کے ساتھ سیاسی مذاکرات اور انتظامی امور میں بات چیت اور تبادلہ خیالات میں بڑی مشکل پیش آرہی تھی۔ چونکہ سر ظفر اللہ خان اور ان کی جماعت احمدیہ کے انگریزوں سے پرانے اور دوستانہ تعلقات تھے۔ اس جماعت کے تمام لوگ انگریزوں کے پرانے نمک خوار اور وفادار خادم تھے۔ اور ''آقا اور غلام'' جیسے رشتہ رکھتے تھے۔ قائداعظم کو مشورہ دیا گیا کہ سر ظفر اللہ کو ٹیم میں شامل کرنے سے یہ فائدہ ہوگا کہ وہ انگریزوں سے اپنی روایتی وفاداری اور تابع داری کا واسطہ دے کر حالات کو بہتر اور دوستانہ بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمایئے فلپ زیگلر (Philip Zeigler) کی کتاب لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی زندگی (Life Of Lord Mountbatten) اور الیکس وان تزلمین (Alex Von Tuhzelmann) کی ''دی انڈین سمر'' (The Indian Summer, A sectret history of an Empire)۔ نیز مارچ ۱۹۷۵ء میں بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے خود اعتراف کیا تھا کہ وہ مسٹر جناح کو پسند نہیں کرتے تھے اور اس بناء پر سیاسی اور انتظامی امور میں مشکلات پیش آرہی تھیں۔

یہ وہ وجوہات تھیں جن کی وجہ سے مجبور ہو کر قائداعظم نے سر ظفر اللہ خان کو وزارتِ خارجہ کا عہدہ دے کر اپنی ٹیم میں شامل کرلیا تھا۔ مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ قائداعظم کی ٹیم میں اور بھی بہت سے لوگ شامل تھے۔ لیکن اِنھی لوگوں نے اُن کے ساتھ نہ صرف بے وفائی کی بلکہ غداری کی۔ اُن کی آنکھیں بند ہوتے ہی اُن کے وزیر اعظم کو قتل کیا اور پھر قتل کی تفتیش کرنے والی ٹیم کو ہلاک کروایا۔ بعض روایات کے مطابق قائداعظم طبعی موت نہیں مرے تھے بلکہ انہی منافق ساتھیوں نے ان کو مروا دیا تھا۔ کئی گھنٹوں تک ایمبولنس کی گاڑی کو روکے رکھا۔ جب ان ملعونوں کو یقین ہوگیا کہ قائد کی روح قفس عنصری سے پرواز کرچکی ہے تب ایمبولنس کی گاڑی کو اندر جانے دیا تاکہ مردہ لاش لے جائے۔

اس کے بعد پاکستان میں انحطاط اور زوال کا جو دور شروع ہوا اور جو طوفان برپا ہوا جس نے انسانیت اور شرافت کے تمام آثار مٹا کر رکھ دیئے۔ وہ ایک دردناک کہانی ہے جس کا سب کو علم ہے۔ اُسے یہاں دوہرانے کی ضرورت نہیں۔

پھر اس کے بعد سرِ دشت ایسی خاک اڑی
میں دور ' دور گیا تیرا نقش پا نہ ملا

خان آف قلات میر احمد خان' قائداعظم کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ قائد کے بیماری کے آخری دنوں میں کوئٹہ اور زیارت میں وہ قائد کے ساتھ ہوتے اور تیمارداری میں مصروف رہتے۔ ۱۹۵۰ء میں انھوں نے کوئٹہ میں ایک پریس کانفرنس میں یہ انکشاف کیا تھا کہ مرنے سے دو دن پہلے قائداعظم نے ان سے کہا تھا۔ ''احمد یار مجھے اپنے ساتھیوں سے بڑی مایوسی ہوئی ہے۔ انہوں نے میرے ساتھ دھوکہ کیا۔ "They have let me down."

جب قائداعظم اپنے دوسرے ساتھیوں کی بے وفائی اور منافقت سے ناواقف تھے تو پھر کس بناء پر اور کس شہادت اور ثبوت پر ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ قائداعظم کو سر ظفر اللہ خان کے اصلی عزائم اور نیت کا علم تھا اور وہ خان کی دل کی بات جانتے تھے۔ اور چونکہ قائداعظم نے ان کو وزیر خارجہ کا عہدہ پیش کیا تھا' لہٰذا وہ تنقید اور احتساب سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ سر ظفر اللہ پر تنقید قائداعظم کے صواب رائے پر تنقید سمجھا جائے گا۔ میرے خیال میں اس طرح کی سوچ، منطق اور استدلال علمی اور تاریخی حلقوں میں تو نہیں بلکہ مچھلی منڈی کے خوانچہ فروشوں میں پائی جاتی ہے۔ کیا قائداعظم کو معلوم تھا کہ ان کا اپنا مقرر کردہ وزیر خارجہ ان کی وفات پانے کے بعد ان کی نماز جنازہ میں شرکت نہیں کرے گا اور شرکت کرنے سے اس بناء پر انکار کرے گا کہ مرحوم احمدی نہیں بلکہ ان کے عقیدہ کے مطابق وہ غیر مسلم ہے۔ مگر طوالت کے ڈر سے میں تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا مگر کئی ایسے لوگ تھے جن پر قائداعظم نے اعتبار کیا تھا۔ ان کو اہم ذمہ داریاں سونپی گئیں تھیں مگر ان لوگوں نے قائد کے ساتھ بے وفائی کی اور ان کی مرضی کے خلاف کام کیا۔ اور ان کو مایوسی سے دوچار ہونا پڑا۔ میں یہاں صرف پانچ ناموں پر اکتفا کروں گا۔ یعنی (۱) سردار شوکت حیات (۲) خورشید انور (۳) بریگیڈئر اکبر خان (۴) بریگیڈئر شیر خان (۵) بریگیڈئر افتخار۔ (بریگیڈئر افتخار غالباً احمدی تھے اور ہندوستانی فوج سے تبدیل ہو کر پاکستانی فوج میں شامل ہو گئے تھے۔ پاکستان اور قائداعظم سے وفاداری کا حلف اٹھانے کے باوجود وہ انگریزوں کے لیے جاسوسی کا کام کرتے تھے۔ قائداعظم اور لیاقت علی خان کی وہ تمام باتیں جو فوج اور کشمیر سے متعلق تھیں وہ سب C-in-C جنرل Messervy کو پہنچا دیا کرتے۔ پھر یہ فوجی راز Lord Mountbatten اور پنڈت نہرو تک پہنچ جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۷ء میں جنگ آزادی کشمیر میں قبائلی مجاہدین سری نگر تک نہ پہنچ سکے کیونکہ ہندوستانی فوج کو ان کی آنے کی خبر پہلے پہنچ چکی تھی۔

مزید تفصیلات کے لیے دیکھئے جناب طارق علی کی کتاب The Clash of Funda Mentalists.
(Chapter on Kashmir)

سر ظفر اللہ خان کے حق میں راجہ جی نے جو ثبوت پیش کیا ہے وہ ظفر اللہ خان کی اپنی خودنوشت کتاب ''تحدیث نعمت'' ہے۔ اب یہ ایک عام بات ہے اور ہر طفل مکتب کو اس بات کا علم ہے کہ خودنوشت کتابیں مجموعی طور پر جھوٹ کا پلندہ ہوا کرتی ہیں اور ان کتابوں کی کوئی تاریخی اور علمی حیثیت نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ مصنف کے حق میں بطور شہادت پیش کی جا سکتی

ہیں۔ کیونکہ عام طور پر لکھنے والے اپنی تعریف اور خودستائی اور تشہیر میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ جھوٹوں کی تشہیر ہوتی ہے اور حقائق اور سچائی کا گلہ گھونٹ کر اسے چھاپا جاتا ہے۔ اور یہی دراصل خودنوشت کتابوں کا اصل مقصد ہوتا ہے کیونکہ مصنف اپنے آپ کو خوبیوں اور کمالات کا مجسمہ بنا کر پیش کر کے ہیرو بننے کی کوشش میں رہتا ہے۔ اپنی خامیوں، کوتاہیوں اور غلطیوں کا ذکر ہی نہیں کرتا بلکہ ان پر پردہ ڈالتا چلا جاتا ہے مگر اپنی تعریفوں کا پُل باندھتا رہتا ہے۔ وہ تاریخی حقائق جو مصنف کے اپنے خیالات اور عقائد سے ٹکراتے ہوں یا ان تاریخی حقائق سے مصنف کی اپنی شہرت اور نیک نامی پر حرف آتا ہو تو وہ ان تمام حقائق کو یا تو سراسر نظر انداز کرتا ہے یا ان کو اپنی مرضی، سوچ اور سیاسی عقیدہ کے مطابق توڑ موڑ کر پیش کرتا ہے۔ وہ قارئین جو حالات کے تاریخی پس منظر سے واقفیت نہیں رکھتے، وہ مصنف کے پروپیگنڈا کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا سر ظفر اللہ خان کی خودنوشت کتاب ''تحدیث نعمت'' کو بھی اسی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہیے کہ یہ کتاب جھوٹ، غلط بیانی اور پروپیگنڈا کی ایک دستاویز ہے اور سراسر ناقابل اعتبار عام طور پر اس قماش کے خودنوشت کتابیں ایک خاص سیاسی مقصد کے لیے لکھی جاتی ہیں۔ اور ان کی افادیت چند خاص اغراض تک محدود ہوتی ہیں۔ اگرچہ اس کلیہ سے چند کتابیں اور مصنفوں کو مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے مگر مجموعی طور پر اس قسم کی کتابوں کے مصنفین سب اس جرم، دروغ گوئی میں مبتلا ہیں اور اس حمام میں سب ننگے ہیں ظفر اللہ اکیلے نہیں ہیں۔ میرا یہ دعویٰ ہے کہ سر ظفر اللہ خان انگریز سامراج کے پروردہ، خطاب یافتہ، ذہنی غلام اور نظریاتی چاکر اور کٹر قسم کے صہیونی ٹوڈی تھے اور وہ اپنی تمام زندگی میں انگریزی سامراجی مفادات اور صہیونیت کی ارتقاء کے لیے کام کر رہے تھے۔ وہ اپنی غلامی روایات اور مذہبی عقائد کے تحت درِ خسروی کی غلامی قبول کر چکے تھے اور اپنی ساری زندگی میں وہ ان مذموم مقاصد کے حصول کے لیے کام کرتے رہے تھے۔

میں سر ظفر اللہ خان کے دربار کے اُن تمام قصیدہ خوانوں اور ثنا خوانوں کو چیلنج کرتا ہوں کہ سوائے ان کی لمبی لمبی اور بے معنی اور بے مقصد تقریروں کے، مجھے ان کا ایک ایسا کارنامہ دکھائیں جس سے مسلمانوں کو مجموعی طور پر فائدہ ہوا ہو۔ میں اپنے اس دعوے کے ثبوت میں دلائل اور شواہد پیش کرتا جاؤں گا اور سر ظفر اللہ خان کے چہرے سے تقدس کا نقاب اتارتا چلا جاؤں گا۔ سر ظفر اللہ خان کی خودنوشت سوانح ''تحدیثِ نعمت'' پر تفصیلی بحث سے پہلے میں دو اور خودنوشت کتابوں پر مختصر تبصرہ کروں گا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کروں گا کہ اس طرح کی کتابیں کس قدر ناقابل اعتبار ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے میں فیلڈ مارشل جنرل ایوب خان کی کتاب "Friends, Not Masters" کی مثال پیش کروں گا۔ یہ کتاب جنرل ایوب خان کی خودنوشت سمجھی جاتی ہے مگر عام خیال یہ ہے کہ یہ لکھوائی گئی ہے۔ بہرحال اس کتاب کے مطابق اللہ نے اس قوم (پاکستان) پر کرم کیا اور ایوب خان جیسے مدبر جنرل کو مسیحا بنا کر بھیجا۔ کیوں کہ یہ ملک تباہی کے گڑھے میں گر رہا تھا اور کتوں کے منہ کا نوالہ بن رہا تھا۔ (Going to dogs)

جنرل صاحب کے آتے ہی ملک تباہی کے منہ سے نکلا اور پھر کیا تھا کہ ہر طرف دودھ اور شہد کی نہریں بہنے لگیں۔ خوش حالی اور بنیادی جمہوریت کی برکات سے لوگ فیض یاب ہوئے اور پاکستان جنرل ایوب کی زیر قیادت دنیا کا ترقی یافتہ اور خوش حال ترین ملک بن گیا۔

اس خودنوشت کتاب میں مخالفین کے قید و بند اور قتل و غارت کا کوئی ذکر نہیں۔ قوم کو گردن تک بین الاقوامی قرضوں میں ڈبونے کا اعتراف ہے نہ ندامت۔ قومی دولت کو صرف ۲۲، ۲۳ خاندانوں میں تقسیم کرنے کا کوئی بیان نہیں۔ پشاور کا ائر پورٹ امریکی جاسوسی کارروائیوں کے لیے امریکی دہشت گرد تنظیم سی آئی اے کے حوالے کرنے کا کوئی اشارہ نہیں۔ ہمسایہ ملک ہندوستان سے فضول اور بے مقصد جنگوں کا آغاز کر کے ہزاروں نوجوانوں کو شہید کروانے کا کوئی اعتراف نہیں۔ اپنی آمرانہ اور ظالمانہ طرزِ حکومت پر کوئی تبصرہ نہیں۔ ان کی آمریت کے متعلق فیض احمد فیضؔ نے کیا خوب کہا تھا:

اب اگر جاؤ پئے عرض و طلب ان کے حضور
دست و کشکول نہیں ، کاسۂ سر لے کے چلو

دس سال تک لوگ ظلم و ستم سہتے سہتے تنگ آ گئے اور آخر کار بغاوت پر اتر آئے۔ یعنی ''تنگ آمد بجنگ آمد'' والی بات ہوئی۔ کیوں ملک میں صورت حال یہ تھی کہ:

دل ضبط ، زبان ضبط ، فغان ضبط و قلم ضبط
دنیا میں ہوئے ہوں گے یہ سامان بھی کم ضبط

اور پھر حال ہی میں ایک اور جنرل نے خودنوشت چھاپی ہے۔ جنرل پرویز مشرف کی کتاب "In The Line Of Fire" کو پڑھنے کے بعد یہ تاثر ملتا ہے کہ پاکستان کی سولہ کروڑ آبادی محض احمقوں پر مشتمل ہے۔ اس مخلوق سے عقل و دانش بالکل رخصت ہوگئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بدنصیب قوم پر رحم کی نظر ڈالی اور کمال مہربانی سے ایک ایسے جنرل کو اصلاحِ احوال کے لیے بھیجا جو کہ ''ہر فن مولا'' ہے۔ اور ہر علم میں حیرت انگیز قابلیت اور ذہانت کا مالک ہے۔ بہادر ایسا کہ کارگل کے پہاڑ اس کے نام سے کانپ جاتے ہیں اور فوجی حکمت عملی کا ایسا ماہر کہ سکندر اعظم اور نپولین اس کی شاگردی اور چاکری پر نازاں ہوں۔ اقتصادیات کا ایسا ماہر کہ دنیا کے بڑے سند یافتہ اقتصادیات کے ماہر اس کے آگے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔ سیاست دان اور عالمی امور پر مدبر ایسا کہ افلاطون اس کے جوتے سیدھا کرنے پر فخر محسوس کرے۔ روشن خیال اس بلا کا کہ آفتاب و ماہتاب اس کی روشن خیالی کے آگے ماند پڑ جائیں۔

اُس نے اپنی خداداد قابلیت اور مہارت سے اور چچا سام کی مدد سے پاکستان کو اقتصادی تباہی سے نکال کر اس کی کایا پلٹ دی۔ اب ہر طرف دیکھو موبائل فون اور چمکتی قیمتی کاریں ہی نظر آئیں گی۔ مگر جنرل صاحب حقائق پر پردہ ڈالنے کے شوق میں یہ بتانا بھول ہی گئے کہ یہ موبائل فون اور یہ چمکتی کاریں پاکستان کی آبادی کے صرف ۵ فیصد سے کم تک محدود ہیں۔ ۹۵ فیصد پاکستانی زندگی کی بنیادی ضروریات سے یکسر محروم ہیں۔ نہ تو پینے کے لیے صاف پانی میسر ہے اور نہ ہی قیامت خیز گرمی سے بچنے کے لیے بجلی دستیاب ہے۔ ہر سال ہزاروں لوگ گندا پانی پینے سے موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جہاں انصاف کا فقدان ہے اور کرپشن کا راج ہے۔ بنیادی طبی امداد اور بنیادی انصاف ''جنسِ نایاب'' ہیں۔ قومی آمدنی کا صرف ۴ فیصد تعلیم اور صحتِ عامہ پر خرچ ہوتا ہے جب کہ ۷۰ فیصد فوج اور فوجی جرنیلوں کی شاہانہ زندگی کو برقرار رکھنے پر خرچ کیا جاتا ہے۔

جاری ہے